# مسلمانانِ ہند کے زوال کے داخلی اسباب

از

ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب ایم اے ڈی لٹ لکچرر پنجاب یونیورسٹی

ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر سید عبد اللہ شاہ صاحب جو پنجاب کے مشہور صاحب قلم فاضل و محقق ہیں۔ اس مرتبہ برہان کی محفل میں پہلی بار تشریف لائے ہیں، آپ کا یہ مقالہ موضوع بحث کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔ اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس مقالہ کا مطالعہ خالص علمی اور تاریخی نقطۂ نظر سے کرنا چاہیے۔ ورنہ ممکن ہے بعض زود رنج طبیعتیں سلاطین کے ساتھ اپنی غیر معمولی عقیدت و ارادت کے باعث مضمون کے بعض حصوں سے ناگوار اثر قبول کرلیں۔

"برہان"

یہ ایک عجیب واقعہ ہے۔ کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں کم وبیش ایک ہزار سال تک حکومت کی لیکن آج تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ عظیم الشان سلطنت جب گری تو کیسے گری؟ کون سے وہ اسباب مادیہ تھے۔ جو اس بے نظیر نظامِ حکومت کے زوال اور انحطاط کا سبب بنے؟ مسلمانوں کی کن نفسی اور روحانی کمزوریوں کی بنا پر انہیں اس ملک میں غلام بننا پڑا جس میں وہ نو سو سال تک صاحبِ تاج و تخت رہے؟۔

بہت سے مورخین ہند نے ان اسباب و علل کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے لیکن ان میں سے بیشتر حضرات نے اپنے آپ کو سیاسی بواعث اور وجوہ تک محدود رکھا ہے۔ حالانکہ کسی قوم یا جماعت کی ترقی و تنزل کے راز کو معلوم کرنے کے لیے سطح کو چھوڑ کر اس قوم کے نظام عصبی، اس کے دل و دماغ اور اس کے ذہن اور نفسیات کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے۔ سیاسی واقعات ان بے شمار اثرات کا ایک آخری نتیجہ ہوتے ہیں

جو در پردہ کسی قوم کے مزاج اور نفس میں سالہا سال کارفرما رہتے ہیں اور بالآخر وہ کسی نمایاں شکل میں ظہور پذیر ہو کر اقوام کی موت کا باعث بنتے ہیں۔

**زوال کی فلسفیانہ تعبیر و توجیہ**

موجودہ مقالہ میں ہمیں امراض نفسی کی تشریح و توضیح کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ اس کے لیے ناظرین کرام شپنگلر کی کتاب The Decline of the West - ابن مسکویہ کی کتاب "تجارب الامم"، علامہ ابن خلدون کی تاریخ کا مقدمہ، لیبان کی کتاب "انقلاب الامم" کا مطالعہ فرمائیں۔ آج کی بحث میں ہم بعض ایسی ذہنی اور اخلاقی علامتوں کا پتہ چلائیں گے جو مسلمانانِ ہند کے انحطاط کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں اور اگر کوئی مبصر ان علامتوں سے مستقبل کا پتہ چلا سکتا تو شاید ہندوستانی مسلمانوں کو اس قدر جلد زوال نصیب نہ ہوتا، لیکن چونکہ مبصرین کی نگاہیں خیرہ اور قوم کی فطرتیں مسخ ہو چکی تھیں اس لیے تدبیر کی طرف توجہ نہ کی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کی مشرقی سلطنت کی قبا پارہ پارہ ہو کر فضائے آسمانی میں اُڑ گئی ولکلِّ اُمّةٍ اجل اذا جآء اجلھم لا یستأخرون ساعةً ولا یستقدمون

**قومی ترقی کے دو اصول**

علامہ ابن خلدون کا قول ہے کہ "ہر ترقی پانے والی حکومت کی تہ میں کوئی سیاسی یا دینی اصول کارفرما ہوتا ہے" جس کے زیر اثر تمام قوم کا ذہن اور مزاج ایک بن جاتا ہے۔ جو خیالات میں وحدت اور جذبات میں یگانگت پیدا کرتا ہے۔ یہی چیز "عصبیت" کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ عصبیت یا تو دینی ہونی چاہیے یا اس کا تعلق نسل اور وطن سے ہونا چاہیے۔ جس قدر یہ عصبیت کسی قوم کے مزاج میں راسخ ہوگی اسی قدر اس کے عزائم بلند، اُس کا نصب العین واضح اور اُس کا راستہ متعین ہوگا اور جس قدر اس عصبیت میں کمزوری ہوگی اُسی قدر اس کے ارادے پست، اس کی وحدت کمزور اور اُس کا شیرازہ منتشر ہوگا۔ وہ خس و خاشاک کی طرح ہوا کے ہر جھونکے سے جگہ بدلتی اور خشک بادلوں کی طرح اِدھر اُدھر گھومتی نظر آئیگی۔ اور کسی واضح نصب العین کے فقدان، اور عصبیت کی کمزوری کی وجہ سے اس آگ کی طرح جس کے اجزا ایک دوسرے کو کھا لیتے ہیں، آپس میں ہی کٹ کر مر جائیگی۔

**ہندی مسلمانوں کی حکومت** اگر غور کیا جائے تو ہندوستان میں صحیح معنوں میں اسلامی حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی۔ عربوں کے زوال کے بعد ترک اقوام نے ہندوستان پر قبضہ کیا۔ ان کی رگوں میں ترکی اثرات کارفرما تھے۔ ان کے خیالات ترکی تربیت کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے تھے۔ انہوں نے اسلامی فلسفہ اخلاق اور نظامِ سیاست کو جامۂ عمل پہنانے کی بجائے ترکی اصول اور رجحان کو پھیلایا۔ ان کا نقطۂ نظر اسلامی نہیں نسلی تھا۔ مذہب کا غلغلہ بھی بلند ہوتا رہا۔ لیکن مذہب کو نسلی رجحانات کی تقویت کا ذریعہ بنایا گیا، اور بس۔ مذہب اسلام کی تبلیغ اور ترویج اور اُس کے تمدنی اثرات کی اشاعت ان بادشاہوں کے مقاصد میں کبھی داخل نہ تھی۔ وہ ترک بادشاہ تھے جن کا مذہب اسلام تھا۔ اس سے زیادہ ہم ان کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ اس دور میں اسلام کی خدمت بھی ہوتی رہی لیکن اس کے مراکز شاہی دربار اور کاخ امیرانہ نہیں تھے بلکہ آبادیوں سے دور تکلفات و تجملات سے الگ ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں یا ویرانوں کے گوشوں میں تھے۔ جہاں خدا کے پاک بندے محبت کا پیغام دے کر لوگوں کو دین فطرت کی طرف بلاتے تھے۔

**مغلیہ سلطنت کے عناصر ترکیبی** مغلوں کی سلطنت بھی 'ایرانی ہندوستانی' سلطنت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی عصبیت ترکی سلطنت سے کہیں زیادہ کمزور تھی۔ ترکوں اور افغانوں میں شدید قسم کی نسلی ذہنیت کارفرما تھی۔ ان کے سامنے نسل اور قبیلہ کا تصور تھا جس کا گہرا اثر ان کے تمام اعمال و افعال میں موجزن نظر آتا ہے۔ ان کی طویل سلطنت ان کے عزم اور تدبر کا پتہ دیتی ہے۔ اگر چنگیز و تیمور کے حملے ان کو کمزور نہ کر دیتے تو غالباً ان کی شائستگی اور امپیریلزم سے بعض عمدہ نتائج پیدا ہوتے۔ تاہم ان اقوام کا نصب العین معین اور مقرر تھا جس سے وہ سرِ مُو تجاوز نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سلطنت مغلوں کے مقابلہ میں زیادہ قوی اور پُرہیبت تھی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ بعض لوگوں کو میرے اس نظریہ سے اختلاف ہوگا۔ کیونکہ ان کی نظروں میں مغلیہ تمدن کے بعض لطیف اثرات کا حُسن سمایا ہوا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مغلیہ تمدن بہت خوبصورت مگر بہت "نازک" تھا۔ جس میں انحطاط اور کمزوری کے جراثیم تھے۔ اس کو اگر ہم پھول سے تشبیہ دیں تو ہم کہہ سکتے

ہیں کہ اس کا رنگ ایرانی اور خوشبو ہندوستانی تھی۔

**ایرانیت کا اثر مغلیہ تمدن پر** ایرانیت بذات خود ایک مسئلہ ہے۔ اس میں جمال اور ذوق حُسن دونوں موجود ہیں مگر قوت نہیں۔ اس میں روشنی ہے، مگر حرارت نہیں۔ اس سے کام و دہاں کو لذت تو ملتی ہے مگر غذائیت بہت کم ہے۔ اسلام ایک مردانہ مذہب ہے، اس پر ایرانی اثرات جس قدر نظر آتے ہیں وہ انحطاط کا موجب تو بنے مگر اُن سے اسلامیت کو تقویت نہیں نصیب ہوئی۔ جب اس ایرانیت کو ہندوستانیت سے امتزاج دیا گیا، جو بجائے خود ایک کمزور تصور کی حامل ہے تو اس کا نتیجہ سوائے انحطاط کے اور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ اس موقعہ پر میرا مقصود ایرانیت اور ہندوستانیت کی مذمت نہیں، مقصود صرف اس قدر ہے کہ مغلوں کا نصب العین متعین نہ تھا۔ ترکی عصبیت کی ان میں کمی تھی۔ "ایرانیت" کا صحیح نمونہ وہ نہ بن سکتے تھے۔ اور بیرونی اور خارجی ہونے کی وجہ سے "ہندوستانی عصبیت" کو ان پر کامل اعتماد نہ تھا۔ باقی رہا اسلام سو وہ سرے سے موضوع بحث نہ تھا۔

**ایرانیت اور ہندستانیت کی کشمکش** ایک نوجوان مصنف کی یہ بات غالباً غلط نہیں کہ مغلوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب "ایرانی ہندوستانی کشمکش" تھی۔ مغلیہ تمدن نے ایرانی اور ہندوستانی عناصر کو امتزاج دینے کی ایک لاحاصل کوشش کی۔ فطرت انسانی اس درجہ تفرد پسند واقع ہوئی ہے۔ کہ وہ اپنی انفرادیت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی، وہ کبھی دوسروں میں جذب نہیں ہو سکتی۔ اور اگر کبھی ہوتی بھی ہے تو وہ امتزاج نہایت عارضی ہوتا ہے۔ دنیا میں مذاہب نے اقوام اور افراد میں ایک وحدت ارادی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ علی الخصوص اسلام نے عرب و عجم، زنگی و رومی، سفید و سیاہ کے تخیل کو مٹانا چاہا لیکن کون نہیں جانتا کہ حق کی آواز بہت جلد قبیلہ اور خطہ کی جنگ میں ڈوب کر رہ گئی۔ کیا شعوبیت اس شجر تلخ کا ناگوار ثمر نہیں؟ کیا ایرانیت کا زہر اسی گیاہ زہردار سے نہیں ٹپکا؟ کیا ترک و عرب کا عناد انہی ملعون اسباب و بواعث کا نتیجہ نہیں؟ یقیناً اسلام نے جو راستہ تجویز کیا وہی حق کا راستہ تھا۔ لیکن شاید ابھی تک انسان میں اتنی "انسانیت" نہیں پیدا ہوئی کہ

کہ اس بلند تصور کی خوبیوں کا اندازہ کرسکیں خاصکر جبکہ یورپ کا معلم الملکوت انسانی رشتے کو منتشر کرنے کے لیے نیشنلزم اور ڈارونزم کی طرح کے نت نئے نظریے اپنی ذریات شرق وغرب کی طرف پھینک رہا ہے تو اس آرزو کا برآنا مشکل صد مشکل!

**مغلیہ تمدن کی کمزوری** بہرحال مغلوں نے "ایرانی، ہندوستانی" مرکب تیار کرنے کی بے سود کوشش کی جس سے رفتہ رفتہ ان کی حیات کمزور ہوتی گئیں اور ہندوستانیت جو پہلے مغلوب تھی، غالب آنے لگی۔ ہندوستانی مسلمان تو خیر تھے ایرانی یا ترک، ہندوؤں کے ساتھ گہرا میل جول مغلوں کی ترکی عصبیت کے لیے زہر ثابت ہوا۔ جس کے خوفناک اثر کو ایرانی ذہن اور دماغ بھی دور نہ کرسکا۔ عہد شاہجہانی کا ایک مصنف یوسف میرک اپنی کتاب دستور العمل (مصنفہ ۴۴ ۱۰ھ) میں لکھتا ہے۔

"ایں مردم قانون گو۔۔۔ لیکن چوں اکثر ہندو انند و متدین نیستند و درمیان نیز جبراً د قہراً متدین شدہ نیامدہ اند عمل آنہا برخلافِ قانونِ تدین معلوم می شود چراکہ در ہر عمل حاکم واقف اند"

(دستور العمل قلمی ورق ۱۶ ب)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قانونگو جو مغلیہ حکومت کا سب سے بڑا صاحب رسوخ فرد ہوتا تھا ہندو تھا اور سلطنت کے اندرونی راز (مالیات اور فنانس) پر اس طرح قابض ہوگیا تھا کہ مغل اب اس کی ضرورت سے بے نیاز نہ ہوسکتے تھے۔ یہی مصنف زوالِ حکومت کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے تعریضاً لکھتا ہے کہ جب بادشاہ کے رازدار ادنیٰ قسم کے لوگ ہوجائیں تو اُس وقت بادشاہوں کو اپنے زوال کا انتظار کرنا چاہیے۔

**ہندوستانی پارٹی کا ظہور** دراصل اکبر نے ابوالفضل اور فیضی دو ہندوستانی علماء کی مدد سے "ایرانی ہندوستانی" امتزاج کی داغ بیل ڈالی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکبر کے زمانہ میں ایرانیت اس درجہ غالب تھی کہ ہندوستانیت اُس کے سامنے سر نہ اُٹھا سکتی تھی لیکن آہستہ آہستہ ایرانیت کمزور ہوتی گئی اور ہندوستانیت نے غلبہ پانا شروع کیا۔ اب چونکہ یہ ایک غیر فطری امتزاج تھا، اس لیے بہت جلد ان دونوں عناصر میں کشمکش پیدا ہوگئی، اور مغرور ایرانیت

نے بظاہر مغلوب ہندوستانیت کے خلاف نفرت کا اظہار شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ ایک سرکش ہندوستانی پارٹی کا ظہور تھا۔ جو نہ صرف سیاسیات میں ہی بلکہ خود ادب و فن میں بھی ایرانیت سے برسرپیکار رہو گئی۔ مغل بادشاہوں پر ہندوانہ اثرات اس قدر غالب آچکے تھے کہ اب وہ ان دو مخالف فریقوں کو اپنے فائدے کے لیے متحد کرنے کے قابل نہ تھے۔ اس کشمکش کا انجام مغل مرکزیت کا زوال اور سلطنت کا انحطاط ہوا۔

**کشمکش کے آثار ادب میں** عہد شاہجہانی کے ادب میں اس کشمکش کے بہت سے نشانات ملتے ہیں۔ ملا شیدا اور منیر لاہوری ہندوستانی جماعت کے لیڈر تھے۔ ایرانی علماء و فضلا عام طور پر ہندوستانی شعراء کی شاعری کا استخفاف کیا کرتے تھے، جو قدرتی طور پر ہندوستانی شاعروں کو گراں گزرتا لیکن مغرور "ایرانیت" نتائج سے بے پروا ہو کر ہندوستانیت کو حقارت کی نظر سے دیکھتی۔ اور خسرو، حسن، فیضی جیسے ہندوستانی سخنوروں کا ذکر بُرے لہجے میں کیا جاتا۔ اس سلسلہ میں یہ بات خاص ذکر کے قابل ہے کہ ایران کے شاعر کس مپرسی کی حالت میں ہندوستان میں وارد ہوتے، اور شاہانِ ہند کی فیاضیوں سے اپنے جیب و دامن کو بھرتے لیکن پھر بھی موقعہ بے موقعہ ہندوستان کی مذمت کیا کرتے۔ مثلاً ایک ایرانی شاعر حیدری شکایت ہندوستان میں یہ رباعی لکھتا ہے:-

در کشور ہند شادی و غم معلوم　　آنجا دل شاد و جاں خورم معلوم
جائیکہ بہ یک روپیہ آدم نخرند　　آدم معلوم و قدر آدم معلوم

(اس کی بیشمار مثالیں اور بھی ہیں لیکن بخوفِ طوالت ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے)

**آزاد بلگرامی اور خان آرزو** اس ذہنیت کا ردِعمل قدرتی تھا۔ ہندوستانی جماعت کے علمبرداروں کے دل میں اس سے جذبۂ منافرت پیدا ہوتا جس کا اظہار خانِ آرزو اور آزاد بلگرامی کی کتابوں سے بخوبی ہوتا ہے۔ موخر الذکر اپنی کتاب "خزانۂ عامرہ" میں حیدری کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فقیر ہم نظر بہمیں معنیٰ ایں مطلع گفتہ ام ؎ در کاکل بتاں دل بد خو فغاں کند؛ ہمچوں مغل شکایت

ہندوستاں کند۔ مذمت ہندکردن تخصیص حیدری نیست بلکہ اہل ولایت وتوران قاطبتہً با آنکہ بہند آمدہ از حالت گدائی بمرتبہ امیری میرسندواز نکبت قلندری برآمدہ بدولت سکندری فائز می شوند پاس حقوق را اصلاً بخاطرنے گذارندوزبانِ خودراکہ عمرہا نمک ازخوانِ الوانِ ہند خوردہ بانواع مذمت می آلایند....“ (خزانۂ عامرہ ص ۱۸۸)

خان آرزو نے بھی اپنی کتاب مثمر وغیرہ میں اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہندوستانی ایرانی نزاع نہایت خوفناک حد تک ناخوشگوار ہوگئی تھی اور اس کا زہر سیاسیات سے متجاوز ہوکر ادب میں بھی سرایت کرچکا تھا۔ یہی جذبہ شیعہ سنی سوال کی شکل میں بھی جلوہ گر ہوتا رہا علی الخصوص دکن میں بیجاپور کے عادلشاہیوں میں اس کا رنگ بہت گہرا نظر آتا ہے۔ بہرحال محمد شاہ کے عہد میں یہ کشمکش انتہائے عروج تک پہنچ گئی۔ ادھر اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں ایرانیوں کی ہندوستان میں درآمد کم ہوگئی تھی۔ جو ایرانیت کی کمزوری پر منتج ہوئی۔ اس سے ہندوستانیت کو اور تقویت مل گئی۔ نادرشاہ کی خونریزیاں، فرخ سیر کا انجام، احمد شاہ ابدالی کے حملے سب اسی کشمکش کے مظاہر ہیں، جن میں مغلیہ تمدن کے وہ اجزا آپس میں ہی دست وگریباں ہوکر اپنے آپ کو ختم کررہے تھے۔ اِدھر ہندویت جو صدیوں سے پامال تھی، اس کے لیے یہ موقع مغتنمات میں سے تھا وہ اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے منتظر تھی اور اُدھر ہندوستانی بادشاہوں نے بحری بیڑہ[1] بنانے سے جو غفلت کی تھی اور مغربی اقوام کی سیاسی چالبازیوں اور پُرفریب طریقِ تجارت کے بارے میں جس بےخبری کو روا رکھا اُس کے نتیجے کے طور پر مغرب مداخلت کے لیے ہمہ تن آمادہ — !

پھر کیا ہوا؟ اس کو آپ جانتے ہیں!

اس کا علاج | مغل اس صورتِ حالات کا مقابلہ کرسکتے تھے لیکن اُنہوں نے داعیان الی الحق کی بات نہ

[1] عالمِ اسلام کے مجموعی زوال کے اسباب میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ انہوں نے وفی الفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس کے فلسفہ پر غور نہیں کیا۔ تفصیل کے لیے ترجمہ سفرنامہ ابن بطوطہ دیباچہ از خلیفہ محمد حسین ایم اے۔

بنتی۔ اس کے علاج کی دو صورتیں تھیں۔ اول یہ کہ اسلامی رجحان کو تقویت دیتے۔ دوم یہ کہ ترکی عصبیت کو کمزور نہ ہونے دیتے۔ اسلامی تصوّر سے غفلت کے خلاف خود جہانگیر کے زمانے میں ہی حضرتِ مجددؒ سرہندی نے آواز بلند کی تھی۔ لیکن اکبر ایرانی ہندوستانیت کے سامنے اس درجہ گر چکا تھا کہ خالص اسلامیت اب صدائے بے ہنگام کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ حضرتِ مجددؒ کی تلقین بظاہر بیکار گئی!

پھر اگر ایرانیت نے ہندوستانیت کو اُبھارا تھا تو اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ ہندوستانیت کا پایہ بلند کرتے اور ایرانی ہندوستانی کشمکش کو بالکل اُبھرنے نہ دیتے۔ اس کے لیے اسلامیت کو فروغ دینا ضروری تھا۔ عالمگیر نے یہی راستہ اختیار کیا۔ اُس نے ایرانیت اور ہندوستانیت کی کشمکش کو ختم کر دینے کے لیے اسلامیت کی صدا بلند کی لیکن اُس نے بھی عمر عزیز کے پچیس سال ایک ایسے بیکار مشغلے میں صرف کر دیے جس نے سمندر کی طرف سے آنے والے دشمن کے لیے راستہ کھول دیا اور ملک کے اندر کی ہندویت کو کھلا میدان مل گیا۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اور گذشتہ صدی میں سید احمد صاحب بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید نے بھولی ہوئی اسلامیت یاد دلانے کی کوشش کی لیکن اب جن اینٹوں پر اس عمارت کی تعمیر مقصود تھی، وہ ہی متفرق اور بوسیدہ تھیں۔ ٹیپو سلطان، حافظ رحمت خاںؒ، اور سراج الدولہ اس گرتے ہوئے قصر کی دیواروں کو کھڑا کرنے کی کوشش میں خود ہی یکے بعد دیگرے ہلاک ہو گئے۔

**ترکی عصبیت کا فقدان**

دوسرا علاج یہ تھا کہ خاندان امیر تیمور گورگان کی ترکی عصبیت کو زندہ کیا جاتا۔ مغلوں میں جب تک ترکی حیات موجود تھیں ان میں قوت تھی جس کے ذریعہ وہ مخالف عناصر کو متحد کر سکتے تھے لیکن جوں جوں یہ کمزور ہوتی گئیں اُن میں وہ قوت فنا ہوتی گئی۔ آخری مغل شہزادوں میں ایک صاحب اظفری تھے جن کا پورا نام مرزا محمد ظہیر الدین علی بخت عرف مرزا کلاں تھا۔ انہوں نے ۱۲۱۱ھ میں میر علی شیر فانی کی ایک ترکی کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے جس کے دیباچہ میں وہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے متعلق نہایت دلچسپ اور سچی بات لکھ گئے ہیں:

"وحالانکہ زبانِ ترکی بعد از شنقار فرمودن حضرت محمد شاہ بادشاہ جمجاہ الملقب بہ فردوس آرامگاہ چناں از شاہ جہاں آباد و توابع آں مفقود گردید گوئی عنقائے بود کہ از میان خلق رمیدہ خالی گزیدہ کہ غیر از نام وے را کسے بچشم بینائی ندیدہ چنانچہ زبانزد خاص و عام شد کہ بر محمد شاہ ترکی تمام شد[۵]...الخ"

آگے چل کر یہی مصنف لکھتا ہے کہ مغلوں کے انحطاط کا یہی سبب ہے کہ اب وہ اپنی زبان اور روایات تک سے غافل ہوگئے ہیں۔ اظفری کے ان سیاسی خیالات میں ہمیں ایک بہت بڑے انقلاب پسند کے عزائم نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے خاندان کے زوال کو نہایت غم و الم سے دیکھتا تھا، اور اگر حالات بے حد مایوس کن نہ ہو جاتے تو شاید وہ تقدیر کو بدلنے کی کوشش کرتا۔ چنانچہ وہ اپنے اُستاد میر کرم علی کی زبانی لکھتا ہے:۔

"میر کرم علی .... زبانی اُستاداں تنبیہاً بمن می فرمودند و دریں زجر و پند را آویزۂ گوش ہوش بندہ می نمودند کہ ترکی زبان چابک سلطنت ہندوستان است، از آنا میکہ ترکی از السنہ ایں خاندان شُست گردیدہ سلطنت ہند ضعف پسندیدہ[۶]"

اظفری کے یہ خیالات ہمارے دعوے کی تائید کرتے ہیں اور یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مغلوں کا انحطاط ان کی عصبیت کی کمزوری کا نتیجہ تھا۔ اس کا علاج یا شدید اسلامیت یا پھر کھری اور بے آمیز ترکی حسیات کا احیاء تھا۔ اس کے علاوہ کوئی اور تدبیر ایسی نہ تھی جو کارگر ثابت ہوسکتی۔

**منصبداری نظام** | مغلوں نے اپنی سلطنت کے بقا اور حفاظت کے لیے منصبداری کا نظام قایم کیا۔ جو بلاشبہ اس وقت تک بہت مفید رہا، جب تک مغلوں کی مرکزی قوت منظم تھی۔ بڑے مغل بادشاہوں نے مناصب کو ہمیشہ مرکز کے لیے طاقت کا سرچشمہ بنایا اور اپنے تدبر سے امرا کی ذاتی رقابتوں سے فائدہ اُٹھایا، لیکن بعد میں یہی منصبداری نظام مرکزیت کے لیے مہلک ثابت ہوا۔ اسی جماعت بندی نے قبائلی حس کو تیز اور صوبہ پرستی کے جذبات کو برانگیختہ کیا۔ مغلوں کی راجدھانی دیہات سے اکثر غافل رہی۔ اُنھوں نے دیہات میں بسنے والے عوام کے دُکھ درد سے غفلت کا ثبوت دیا حتیٰ کہ صوبوں کے گورنر بھی اپنے ہیڈ کوارٹرز میں رہ کر دیہات کی اہمیت

۵؎ مرغوب الفواد قلمی ورق ۷ ب (نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری)	۶؎ ایضاً ورق ۸ ب

سے بے خبر رہے۔ جہاں ہندو عصبیت بدستور زندہ رہی۔ منصبداروں نے بھی اپنی بے ضرورت رواداریوں سے مخالف قوتوں کو بڑھنے کا پورا موقع دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزی گرفت کمزور ہونے پر صوبوں میں خودمختاری کے جذبات ابھر آئے اور انہوں نے اردگرد کی مخالف ذہنیت کی مدد سے مرکز کو ایک نئی آنے والی قوم کے لیے نشانہ بنا دیا۔ بہادر شاہ جو شاہ بے خبر کے نام سے مشہور تھے انہی امرا کے طفیل تخت شاہی پر متمکن ہوئے۔ دارا شکوہ اور عالمگیر کی جنگ میں بھی نظام فیصلہ کن ثابت ہوا۔ اور خود الخطاط کے زمانے میں سعادت خاں اور زکریا خاں کی دغابازیوں نے محمد شاہ کو صد درجہ نقصان پہنچایا۔ اور انگریزوں اور مرہٹوں سے جنگ کے دوران میں یہی نفاق وافتراق شکست اور زوال کا باعث ہوا۔

**ہندوستان کی آب و ہوا کا اثر**

ہندوستان کی آب و ہوا میں وہ مسموم اثرات ہیں۔ جن سے ضعف و نقاہت پیدا ہوتی ہے ڈیورنٹ نے اپنی کتاب "تہذیب انسانی کی تاریخ" میں کس قدر درست لکھا ہے کہ "جس ملک کے انسان سال میں چھ ماہ تک کسی کام کے قابل نہ ہوں۔ وہ دنیا کی طاقتور اقوام کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں" باہر کی اقوام جو اس ملک کے ذخائر اور خوشحالی سے متاثر ہو کر حملہ آور ہوتی ہیں کچھ مدت کے بعد "ہندوستانی" بن جاتی ہیں ان کے قویٰ میں مستعدی اور طاقت نہیں رہتی پھر یہاں کے عیش و آرام سے ان میں آرام پسندی اور عافیت کوشی پیدا ہو جاتی ہے۔

**روح عسکریت کی موت**

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے بعد مسلمانوں پر اس تمول اور سامان عیش کی فراہمی کا اثر ہو گیا تھا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے آرام طلبی کی عادت ڈال لی تھی، اس کے برعکس دوسری اقوام میں جدوجہد اور تنازع للبقا کی تڑپ پیدا ہو گئی۔ چنانچہ غلام علی آزاد بلگرامی اپنی کتاب خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں:

زیرکہ درہندوستان است در ہیچ ولایت نیست کثرتِ تمول مردم این ملک را از مشق رزم باز داشتہ در عیش و عشرت بزم می اندازد (ص ۱۱۱)

مرہٹوں کے غلبہ کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"سبب غلبۂ غنیم این است کہ مردم غنیم اقسام محنت برخود گوارا کردہ مشقِ جنگ قزاقی می کنند۔۔

۔۔۔۔ و فراغت شعاران اسلام در آرام طلبی اُفتادہ اند۔ (خزانۂ عامرہ۔ ص ۴۹)

ان اقتباسات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر کے عہد کے بعد مسلمانوں کی روح عسکریت بہت زوال پذیر ہو چکی تھی۔ اکبری دور کے علماء و فضلاء میں ابوالفضل کی زندگی پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ صاحب القلم علامی صرف کاغذ اور دوات کی مصاحبت کا ہی شیدائی نہیں بلکہ ایک جانباز سپاہی اور جرنیل بھی ہے۔ عمدۃ الخواص خانخاناں کے علمی مذاق کو دیکھو اور پھر اُن فتوحات پر نظر ڈالو جو سندھ اور گجرات میں اس کے ہاتھوں انجام پائیں۔ اس کے مقابلہ میں محمد شاہی دور کے ضعف اور فقدانِ عسکریت کا وہ عالم ہے جس کی جانب علامہ آزاد بلگرامی ابھی اشارہ کر چکے ہیں۔

**عسکریت کی جگہ شاعرے** | شعر و سخن کا مذاق مسلمانوں میں ہمیشہ سے چلا آیا ہے لیکن ان ادبی مصروفیات نے مسلمانوں کے فوجی اور عسکری مذاق کو کبھی خراب نہیں کیا۔ مغلوں کے آخری دور کی ادبی اور علمی تقریبات پر غور کرو ان میں بزم کی طرف میلان زیادہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً مشاعروں کا رواج، اسی ایک مشغلہ کے گرد و پیش میں کتنا جمود، کتنا تصنع، کتنا اتلاف وقت اور کتنی بے عملی نظر آتی ہے۔ ایک نظم جس کے لیے قافیہ تجویز کر لیا جاتا تھا، سابقہ و مقابلہ کا موضوع تھی۔ جس میں سیکڑوں ہزاروں شعراء سر کھپاتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ مرض بادشاہوں اور بادشاہزادوں تک پہنچا۔ جنھوں نے سیاسی عقدہ کشائیوں کو چھوڑ کر قافیہ بندی کا شغل اختیار کر لیا۔ اور آخری دور میں ان شعراء کی اتنی کثرت ہو گئی تھی کہ ان کے الگ تذکرے لکھے جانے لگے۔ کریم الدین نے تذکرہ طبقات الشعراء میں اور صابر نے گلستانِ سخن میں تیموری شہزادوں کی شاعری پر بہت کچھ لکھا ہے۔ خود بہادر شاہ کی زندگی میں سوائے مشاعروں اور مشغلۂ شعر کے اور کیا رکھا ہے؟

**مردہ شاعری کا عام تسلط** | شعراء کی کثرت صرف شاہزادگان تک محدود نہیں بلکہ عوام میں بے کار اور مردہ شاعری اس درجہ جاری و ساری معلوم ہوتی ہے گویا ساری قوم کی قوم دنیا میں اسی ایک مقصد کے لیے پیدا کی گئی تھی۔

خوب چند ذکا کے تذکرہ عیار الشعرا میں صرف اُردو کے ۱۵۰۰ شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ دنیا میں صرف ایک فردوسی ایک رومی، ایک شکسپیر، ایک گوئٹے صدیوں تک جماعتوں کے دلوں اور دماغوں کو متاثر کرتا آیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مردہ شاعری کے طومار اور بیکار شعرا کی صفوں کی صفیں بھی ادنیٰ حرکت نہیں پیدا کرسکتیں معترض کہہ سکتا ہے کہ یہ شائستگی اور تہذیب کی علامت ہے لیکن میں کہتا ہوں اگر شائستگی کو کسی زندہ اور جارحانہ نصب العین سے تقویت نہ دی جائے تو ایسی شائستگی موت کا پہلا دروازہ بن جاتی ہے۔ مغلیہ شائستگی کو ایسے ہی زندہ اور قومی نصب العین کی ضرورت تھی

**آخری مغلیہ دور کا ادب** مغلیہ دور کے اواخر کے ادب میں بھی وہی اثرات ضعف نظر آتے ہیں جو یا تو زوال کا پیش خیمہ ہوتے ہیں یا نتیجہ! کسی قوم کا ادب، اس کی اندرونی کیفیات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسا قالب ہوتا ہے جس میں جماعتوں کی ذہنیتیں ڈھلتی ہیں۔ اسی سے ہم قوم کے اخلاقی نظریہ کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ وہی اس کے فلسفۂ زندگی کو آشکارا کرتا ہے۔ اسی سے ان مسائل کا پتہ چلتا ہے جن کے لیے مفکر اور شاعر اپنے اپنے رنگ میں حل تلاش کرتے رہے ہیں۔ غرض ہر ادب ایک فلسفہ اور ایک بلند تصور کا حامل ہوتا ہے[۱]۔ جس میں قوم کی ساری سپرٹ مقید ہوتی ہے۔ وہی مسائل جو فشٹے اور ہیگل نے فلسفیانہ اصطلاحات میں بیان کیے ہیں، ٹنے سن کی شاعری میں موجود ہیں[۲]۔

**آرزوئے موت اور نسوانیت** آخری مغلیہ دور کے ادب کا فلسفہ کیا تھا؟ آرزوئے موت اور نسوانیت۔ یوں تو ساری فارسی شاعری اور ادب میں موت ایک نصب العین ہے لیکن قدیم ادوار میں ہماری شاعری میں بعض ایسے صالح عناصر موجود تھے۔ جن کی وجہ سے اس زہر کا تریاق مل جاتا تھا۔ یونانی فلسفہ اور تصور زندگی سے جو ارسطو[۳]

[۱] Ernest Barker - National character & the factors in its formation. P. 219

[۲] اس بحث کے لیے دیکھو: Histo & Progress - Oakele P. 94.

[۳] ارسطو کے افکار سے خلاصہ کے لیے ملاحظہ ہو۔ Will Durant Story of Philisophy

سے ہم نے سیکھا۔ ہم میں اعتدال کا خیال اس درجہ رائج ہو گیا تھا کہ ہم کسی انقلاب کے لیے سخت کوشش کی ضرورت سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ تبدیلی جو ترقی کے لیے ایک ضروری تدبیر ہے۔ ارسطو کے نزدیک مکاری ہے۔ اس نے ہم میں جمود پیدا کیا اور جمہوری احساس جو اسلام کی سیاسی عمارت میں خشتِ بنیاد کے بمنزلہ تھا ارسطو کے اثر سے معدوم ہو کر رہ گیا۔ توحید جو قرآنی سرچشموں سے پھوٹ کر نکلی تھی یونانی تفلسف اور ہندوانہ رہبانیت اور سنیاس کی نذر ہو گئی۔ زہد، فنا اور اہمسا کے خیالات جو قدیم ہندوستان کے زوال کا سبب بنے تھے۔ اور جن کی وجہ سے آریائی تہذیب خاک و خاکستر ہو کر رہ گئی تھی۔ ہمارے ضابطۂ اخلاق کا جزو بن گئی تھی یہ تمام تصورات بے علمی، ضعف اعتقاد اور سستیِ یقین کا موجب بنے۔ جن کا مجموعی اظہار ہمارے تصور زندگی بلکہ تصورِ موت سے ہوتا ہے۔

**قوم پر آرزوئے موت کا اثر** آرزوے موت زندگی سے نفرت پیدا کرتی ہے اور زندگی سے نفرت مسائل زندگی سے بے اعتنائی کی ذمہ دار ہے۔ اسی زمانہ میں مرزا عبدالقادر بیدلؔ جو فلسفی شاعر تھے، اپنے ایک شعر میں اسی موت کی آرزو کا اظہار کرتے ہیں ؎

زندگی در گردنم اُفتاد بیدل چارہ نیست شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

جب زندگی ایک طوقِ اسیری بن کر مجبور قیدی کے لیے مصیبت بن جائے، تو اس اسیری اور قید میں رہ کر قفس کی تیلیوں یا زندان کی سلاخوں کی استواری کے معاملہ میں زندانی کیا غور کریگا؟ وہ تو یہی چاہیگا کہ جہاں تک ممکن ہو قبر کی آغوش میں آرام کیجیے اور اس مخمصے سے نجات پائیے۔

اس دور کے آرٹ اور شاعری پر ان دونوں حقیقتوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ آرٹ میں انفرادیت اور تنہائی، موت اور خاموشی کی طرف رجحان ہے۔ تاج جو عجائباتِ عالم میں شمار ہوتا ہے، ایک نسوانی مگر زندہ تخیل ہے جس میں ایک مردانہ وار احساس کے تصورِ جمالِ نسوانی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس معاملہ میں یہ اس فن کی انتہا تھی۔ اس کے بعد انحطاط اور کامل نسوانیت کا آغاز ہوتا ہے۔ کانگڑہ اسکول اور آخری مغل اسکول

مصوّری کی موت کا مظہر ہے۔ یہی وہ فنون ہیں جن کے متعلق حضرت علّامہ اقبال نے فرمایا تھا[1]۔

مرگ ہا اندر فنونِ بندگی — من چہ گویم از فسونِ بندگی
بندگی از سرِّ جانِ ما آگہ است — زاں غمِ دیگر سرود او تہی ست
الحذر این نغمہ موت است و بس — نیستی در کسوت صوت آو و بس

انشا اور نسوانیت | انشا اور سودا کی شاعری میں موت کے مضامین کس کثرت سے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ انشا کی وہ "نسوانیت" کتنی زہر آلود ہے۔ جس کا اظہار اس نے بحرالفصاحت میں کیا ہے۔ علم عروض کے افاعیل و تفاعیل کے لیے ہمارے شاعر نے نئے ارکان تلاش کیے ہیں۔ جن میں فعولات کے بجائے "پری خانم" "پری خانم" "پری خانم" کی گردان تجویز کی ہے۔ اس کتاب کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں انسانیت سے شرف اور کمال علوی کا عنصر بالکل مفقود ہو گیا تھا (یا کم از کم جہاں تک شاعری اس دور کے اخلاق کا پتہ دے سکتی ہے اخلاق بہت پستی کی حالت میں پہنچ چکے تھے)

آرزوئے موت اور تقلید جامد | "آرزوئے موت" نے تقلید کا مرض پیدا کیا۔ اس لیے کہ موت پرست زندگی اب نئے راستے پیدا کرنے سے انکار کر چکی تھی۔ تقلید جامد ایک مغربی حکیم[2] کی نگاہ میں خود اپنی پستی کا اعتراف ہے۔
*Imitation is an Inferiority Confessed* پرانی لکیر پیٹنا شاید فقیر اور مجذوب کے لیے دلپسند ہو لیکن زندگی پایاں راستوں پر چلنے سے نفور ہے۔ وہ ہمیشہ نئے پیمانے، نئے قالب ڈھونڈھتی ہے۔ وہ اپنی نشو و نما کے لیے نئی فضائیں نئی ہوائیں تلاش کرتی ہے، وہ اپنے حسن کے اظہار کے لیے نئے رنگ نئے روغن کی جستجو میں ہے۔ تقلید جامد اس کی مسرتوں کو فنا کر دیتی ہے آخر وہ گھٹ کر 'جوئے کم آب' بن جاتی ہے جس میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس قابل نہیں رہتی کہ مسرت کی فضاؤں میں اس کو بار مل سکے۔ صائب نے یہی

---

[1] زبورِ عجم۔ مذہب غلامان۔
[2] *Hass—Nature in English Poetry introduction.*

مضمون معنی بیگانہ کے متعلق پیدا کیا ہے۔

در بکر بستن مضمون رنگیں لطف نیست      کم دہد رنگ ار کسے بند دحنائے بستہ را

**تقلید جامد اور جوابیہ دیوان** | اس تقلید جامد اور رسم پسندی کی صرف ایک ہی مثال دونگا۔ مصحفی جن کی ہجویات سے آپ بے خبر نہیں ہیں۔ اس دور کے سرکردہ شعرا میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی پُرانے شعراء کے جواب میں دیوان مرتب کرنے میں صرف کردی۔ چنانچہ نظیری کا جواب، جلال اسیر کا جواب، ناصر علی کا جواب ان کے کارناموں میں شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح حکیم قدرت اللہ قاسم نے رومی اور سعدی کے جواب میں کتابیں لکھیں۔ جس سے سوائے اس کے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ان میں جدید مضمون کے پیدا کرنے کی قابلیت باقی نہ تھی۔

**غزل میں تصنع** | میں فارسی شاعری میں غزل کو سب اصناف سخن سے زیادہ پسند کرتا ہوں لیکن آخری مغلیہ دور کی غزل کیا تھی؟ محض رسم پسندی اور تصنع کا ذریعہ! غالباً فضلی[1] صاحب کا یہ خیال غلط نہیں کہ غزل جب مشاعروں کی رونق بن گئی تو اُس میں دلی خیالات وجذبات کے بلا تکلف اظہار کی بجائے تصنع اور بے مقصد مسابقت کی اسپرٹ پیدا ہو گئی جس سے ادب اور شاعری تماشا بن کر رہ گئی۔ میں مانتا ہوں کہ مشاعرہ زبان میں دلچسپی پیدا کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے لیکن سچّے شعر کو زبان کی خدمت سے اتنا تعلق نہیں جتنا ایک حساس دل کے حقیقی جذبات کے اظہار سے ہے۔ مشاعرہ اس کو روکتا تو نہیں لیکن قافیہ کی قید اور طرحی مصرع کی پابندی بناوٹ اور آورد کی مؤید ضرور ہے۔

**آزاد بلگرامی کا احتجاج** | علامہ غلام علی آزاد بلگرامی (جن کا ذکر پہلے متعدد مرتبہ آچکا ہے) اس تقلید جامد کے خلاف خزانۂ عامرہ میں آواز بلند کر چکے ہیں۔ ان کے زمانے میں بعض لوگ ایسے تھے جو جدت اور معنی بیگانہ کے نہایت مخالف تھے۔ آزاد ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تازہ مضمون باقی نہ رہنے کی شکایت ناجائز ہے کیونکہ درحقیقت یہ مبدءِ فیاض کے تہی دست ہونے کا اعلان ہے جو ناممکن ہے۔

[1] جناب احمد کریم فضلی آئی سی ۔ ایس صاحب مضمون "غزل" مطبوعہ رسالہ اُردو ۱۹۳۶ء

"ایں کہ گویند مضمون نماندہ غیر مسلم است زیراکہ فیض مبدء فیاض نامتناہی است گر مضامین تمام شود نقصان ایں کس سہل است نقصان مبدء فیاض لازم می آید کہ تہیدست شدہ از فیض رسانی باز ماندہ" (خزانۂ عامرہ ص۶)

لیکن آزاد کی آواز بیکار گئی کیونکہ قوم پر انحطاط آچکا تھا۔ خانِ آرزو اس دور کے بہت بلند پایہ مصنف ہیں لیکن ان کا بیشتر سرمایہ ادب شرحوں، فرہنگوں، مناظرانہ بحثوں پر مشتمل ہے تاہم جو کچھ کیا مفید تھا لیکن شرحوں اور فرہنگوں کی جانب میلان بتلاتا ہے کہ ان کے ذہن و فکر کے سامنے کوئی نیا میدان نہ تھا۔ پھر بھی غنیمت تھے۔ اس کے بعد جو بے جان اور بے روح افکار پیدا ہوئے اُن پر اظہار خیال کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ خود اندازہ کرلیں۔

میں نے اس مضمون کے پہلے حصہ میں زوال کا ایک ہی گہرا سبب پیش کیا ہے یعنی اسلامی نصب العین کا فقدان! پھر میں نے یہ لکھا ہے کہ اگر یہ دینی جذبہ موجود نہ تھا تو قومی، وطنی، یا نسلی احساس اور عصبیت کا ہونا ضروری تھا۔ انہی دو عناصر ترقی کے فقدان سے قوم میں ساری کمزوریاں آگئیں۔ غرض اصلی سبب تو یہی تھا۔ باقی امور (جو بعد میں بیان ہوئے ہیں) بمنزلہ علامات اور نتائج کے ہیں۔ میرے نزدیک وہ سلطنتِ مغلیہ کے انحطاط کا باعث نہیں علامتیں تھیں۔ ادب اور فنون، اخلاق و قواعد زندگی میں جو موت اور ضعف نظر آتا ہے وہ بھی اسی بڑے سبب کا نتیجہ تھا۔

آج ہم ہندوستان میں زندگی کے جس مرحلے میں سے گذر رہے ہیں اس میں ماضی کے اسباق سے ہمیں عبرت اندوز ہونا چاہیے۔ اسلامی نصب العین کی عدم موجودگی، افتراق و تشتت کا باعث بن رہی ہے جب اس مرض نے ہمیں حاکمانہ اور شاہانہ دور میں ذلت کے پست مدارک تک پہنچا کر چھوڑا تو کیا آج غلامانہ زندگی میں اس سے بدتر نتائج کے پیدا ہونے کا خدشہ نہیں ہوسکتا۔ مشرق و مغرب پر ہمارا بے جا اعتماد ہمارے لیے مصائب کے لاانتہا دروازے کھول رہا ہے جس کی طرف ہمارے رہنما ہم کو دھکیل رہے ہیں۔

اس معاملہ میں ہمیں علامہ اقبال کے ایک شعر پر عمل کرنا چاہیے ؎

زندگی انجمن آرا و نگہ دار خود است　　　　اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو با ہمہ شو!